Fikr-o-Nasar (Islamabad) 7:8 (1970)

ادبیاتِ مشرق و مغرب پر

مولانائے روم کا اثر [1]

پروفیسر ڈاکٹر اینماری شیمل [2] بون یونیورسٹی ☆ مترجم: ڈاکٹر محمد ریاض

ایران کے ایک نہایت معروف شاعر مولانا جامی (متوفی ۸۹۸ ہجری) نے مولانائے رومی (م - ۶۷۲ھ) کے بارے میں فرمایا ہے:

من چہ گویم وصف آن عالی جناب　　　نیست پیغمبر ولی دارد کتاب

لفظ "کتاب" سے مثنوی معنوی کی طرف اشارہ ہے۔ دنیا کے بے شمار افراد مثنوی کو ایک متبرک کتاب مانتے ہیں جیسا کہ اس مشہور مصرعے میں مذکور ہے: "ہست قرآن در زبان پہلوی"۔ ع مثنوی شریف حقیقت میں ایک بحر معراج ہے جس میں مختلف رنگ کی قالین نما موجیں ابھرتی نظر آتی ہیں۔ سات سو سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا کہ یہ کتاب صوفیہ اور جہانِ عشق کے دلباختوں کے دلوں میں جاگزیں اور قوت القلوب کا مقام رکھتی ہے۔ دوسری طرف رومی کا دیوان غزلیات، معروف بہ "دیوان شمس تبریزی" پوری دنیا میں مشرق سے مغرب تک مشہور اور عشق الٰہی اور حسرت بے انتہا کے جذبات کا مظہر کامل ہے۔ [3]

مولانائے روم نے اپنی باسعادت زندگی کا بیشتر حصہ سلاجقہ روم کے دارالحکومت قونیہ میں گزارا اور وہیں ۱۲۷۳ء میں دعوتِ واپسیں کو لبیک کہا اور دار الفنا سے دار البقا کو سدھارے۔ آپ

---

[1] مطبوعہ دو ماہی "معارف اسلامی" تہران اگست ۱۹۶۷ء

[2] ANNEMARIE SCHIMMEL.

[3] دیوان شمس تبریزی کے صحیح نز متن کو پروفیسر بدیع الزمان فروز انفر نے دس جلدوں میں تہران سے شائع کروایا ہے (مترجم)　　　ع یہ سراسر شاعری اور مبالغہ ہے۔ (مدیر)

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad.　　http://iri.iiu.edu.pk/

مزار حضرات اب بھی زیارت گاہ اور بلادِ روم کا ایک روحانی مرکز ہے۔

جس طرح مولانا کے شعر و فکر نے سلاجقہ روم کی ادبیات اور تمدن کو متاثر کیا، اسی طرح ان کے "طریقہ مولویہ" نے ترکی کی کلاسیکی موسیقی پر لازوال اثرات چھوڑے اسی طرح ترکی ادبیات اور فنون لطیفہ میں بھی مولانا اور ان کے مریدوں کی مساعی کی صدا گونج رہی ہے۔ قونیہ کے سجادہ نشین عثمانی بادشاہوں کی تخت نشینی کے وقت ان کو شمشیر پیش کرتے اور ان کی حمایت سے سلطان کو ایک طرح کی فوجی مدد حاصل رہتی تھی۔

مولانا کی زبان فارسی تھی اور ترکوں کے لئے اس کا سمجھنا مشکل تھا۔ چنانچہ مثنوی کے تراجم اور شروح کی گئیں اور پہلی شرح سلطان ولد[۴] کے زمانے میں لکھی گئی۔ یہاں ہم مختصراً صرف دو معروف کتابوں کا ذکر کریں گے۔ ایک "شرح آنقرہ لی اسمٰعیل دلیسوتی" ہے جو مثنوی کی بہترین شرح مانی جاتی اور سترھویں صدی عیسوی کے اوائل میں لکھی گئی ہے۔ دوسرا ترکی زبان میں مثنوی شریف کا منظوم ترجمہ ہے جسے سلیمان نہیفی (م ۱۷۳۰ء) نے اسی بحر و وزن میں مکمل کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں عبدالباقی گولپناری صاحب کی تدقیقات و تحقیقات قابل ذکر ہیں۔ فاضل موصوف نے دیوان شمس تبریزی (دیوان کبیر) کو ترکی نثر میں بامحاورہ ترجمہ کر دیا ہے۔ پروفیسر طریکاھیا' اور انقرہ کالج کے ان کے شاگردوں نے بھی تراجم اور تحقیقات میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔

پانچ سال قبل قونیہ میں ایک مختصر مگر جامع رسالہ مولانائے روم کے ادبیات ترکی پر اثرات کے بارے میں چھپا ہے۔ قونیہ کے "مولوی عجائب گھر" کے ناظمِ اعلیٰ محمد اوندر نے اشعار ترکی کا ایک انتخاب شائع کروایا ہے، جس میں پہلا شعر چودھویں صدی عیسوی کے کسی شاعر کا ہے۔ اس زمانے میں ترکی شاعری کے ایک متقدم شاعر "گل شہری" نامی نے مولانائے روم کی تعریف میں ایک غزل کہی ہے۔ یہ روش بعد میں چلتی رہی۔ موجودہ زمانے تک کتنے ہی اعلیٰ و ادنیٰ ترک شعراء نے مولانا روم کی شان میں قصائد لکھے اور ان کی روح پر فتوح سے فیض حاصل کیا ہے۔

---

[۴] مولانائے روم کے صاحبزادے سلطان ولد کی مثنوی ولدی یا ولد نامہ، مولانائے روم اور دوسرے صوفیا کے احوال پر مشتمل اور عارفانہ شعر کا کمال سمجھی جاتی ہے۔ سلطان ولد کا وصال ۷۱۲ھ میں ہوا ہے۔ (مترجم)

معاصر ترکی کے ایک عظیم شاعر اور ادیب" یحییٰ کمال" نے ایک جگہ کہا ہے: "ہم روز محشر تک مولانائے روم کے ہم نفس رہیں گے"۔ کئی صوفی ادیبوں اور دوسروں نے اپنی تالیفات میں مولانا کو اپنا دستگیر و روحانی پیشوا قرار دیا ہے۔ انھوں نے مولانا کے اسرار سماع کو جدید طریقے سے مترنّم کیا ہے۔ مولانا کے طریقہ مولویہ کی رسم سماع نے مشرق و مغرب کے ناظرین اور سیّاحوں کی توجہ کو قرون وسطیٰ سے اپنی طرف مبذول کئے رکھا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ سماع کا یہ طریقہ مولویہ گروہ کا خاصہ نہیں ہے۔ یہ قدیم زمانے سے مختلف غیر متمدن اقوام اور عالمگیر مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان بھی معمول رہا ہے۔ قدیم یونانی فلاسفہ نے ستاروں اور آفتاب کی حرکت میں ایک خاص قسم کی کیفیت سماع کو محسوس کیا ہے۔ بلاد عرب کے مسیحی ماہرین صنعت نے سماع سماوی کو خاص قسم کی صور سے واضح کیا ہے اور ان صور و رموز کے پرتو کی ادبیات، الٰہیات، فلسفہ اور فنون لطیفہ میں موجودگی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے لیکن مولویہ فرقہ کے عاملین کے ہاں ان تمام قدیم افکار و رجحانات کو ایک منظم طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ مولانا نے فرمایا ہے:

معشوق چو آفتاب تاباں گردد — عاشق بہ مثال ذرہ گردان گردد
چون باد بہار عشق جنباں گردد — ہر شاخ کہ خشک نیست رقصاں گردد

یعنی رقص افلاک، انسان کے کرۂ ارض کے مرکز ثقل سے نکل جانے اور ذرّوں کا سورج کے گرد اگرد رقص کرنے کا لازمہ، عاشق کا انائے مطلق الٰہی سے وصال حاصل کرنا ہے۔

یورپ کے جن لوگوں کو حکومت عثمانی کی قلمرو میں داخل اور سماع مولویہ کے دیدار سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا۔ وہ انگشت بدنداں ہوئے ہیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے دو انگلستانیوں کلارک[۵] اور ہاب ہاؤس[۶] نے اس سماع کی خوب توصیف کی ہے اور ابھی تک مسیحیوں میں سماع درویشاں ایک عام عبادت ہے اگرچہ وہ لوگ سماع کے حقیقی مفہوم سے ناواقف ہیں۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر تک مثنوی معنوی کے مطالب کا شہرہ دیار فرنگ میں نہ پہنچا تھا۔ اس صدی میں پہلی بار ترکی میں متعین ایک فرانسیسی افسر جے۔ ڈے[۷]۔ والنبرگ نے مثنوی کو مکمل طور پر فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرایا تھا مگر یہ قیمتی سرمایہ ۱۷۶۶ء میں استنبول میں آتش زنی کی واردات میں

---

۵ CLARKE ۶ HOB HOUSE ۷ J.D. WALLENBERG

جل کر خاکستر ہو گیا۔ اس طرح ایک سو سال بعد ہی مثنوی کا ترجمہ اہل یورپ کو میسر ہو سکا۔ ۱۸۱۸ء میں مشہور مستشرق ہیمر پرگسٹال[8] نے تاریخ ادبیات ایران، تالیف کی اور اس میں مولانائے روم پر خاصی مبسوط بحث کی ہے (یہ وہی شخص ہے جس نے دیوان حافظ کا جرمنی میں ترجمہ کیا۔ اور اسی کو پڑھ کر جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے[9] نے خواجہ سے الہام لیا اور اپنے "دیوان شرق و غرب" کو وجود میں لایا ہے)۔ ہیمر پرگسٹال مثنوی کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے: "یہ کتاب دریائے گنگا کے کنارے سے لے کر سفیر بوغز کی بغل تک ہر کہیں عارفوں کا سرمایہ الہام ہے"۔ مؤلف مثنوی کے بارے میں ہی اس بیان پر اکتفا نہیں کرتا، وہ "دیوان شمس تبریزی" کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے: "۔۔۔۔ مولانا اس کتاب میں ایسے مطالب بیان فرماتے ہیں جو ادیان کی ظاہری حالت سے ماوراء ہیں۔ وہ عشق و محبت کے بال و پر کے ذریعے اس مقام تک پرواز کرتے ہیں جہاں ذات مجرد اور نور سرمدی کے انوار کی بارش ہے۔ مولانائے روم ماہ و آفتاب سے گزر جانے پر ہی اکتفا نہیں کرتے۔ وہ زمان و مکان، خلق و تقدیر، عہد الست اور یوم نشور سے گزرتے ہوئے حقیقت لامتناہی تک جا پہنچتے ہیں۔ یہاں عابد ازلی و ابدی ذات سرمدی سے جا ملتا ہے اور عاشق نامتناہی معشوق لم یزالی سے جا ملتا ہے۔"

ہیمر پرگسٹال نے مثنوی اور دیوان شمس تبریزی کے منتخبات کا ترجمہ کیا ہے اس کے تراجم ناقص اور اصل متن کی تاثیر کے عکاس نہیں ہیں مگر بعض حصے خاصے دلآویز ہیں۔ دیوان حافظ کا جو ترجمہ ہیمر نے کیا ہے اس کے اثرات تو گوئٹے کی تصانیف میں دیکھے جا سکتے ہیں لیکن گوئٹے مولانائے روم سے متاثر نہ ہوا۔ بلکہ اپنے دیوان غربی و شرقی کے حاشیے میں مولانا کے خلاف لکھتا ہے۔ گوئٹے اپنے غیر منطقی بحر افکار میں غرق رہا۔ وہ بعض یورپی افکار کو بغیر سوچے سمجھے مجاز و رموز کے پیرائے میں بیان کرتا رہا۔ بہر طور ۱۸۱۹۔ ۱۸۲۱ء کے درمیان مولانائے روم کے نام نے جرمنی میں ایک تازہ شہرت حاصل کی۔ لنترس کے چرچ تھلاک[10] کے ایک شخص توپ نے ۱۸۲۱ء میں لاطینی زبان میں ایک مختصر رسالہ لکھا اور اس میں مولانائے روم کے فکر و فلسفہ اور عرفان سے بحث کی ہے۔ یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک جرمن عالم کے قلم سے اپنی قسم کا پہلا رسالہ تھا۔ اس رسالے میں مؤلف نے مولانا سے وحدت الوجود کی تعلیم منسوب کی اور بعد کے متعدد لکھنے والوں نے بھی

---

[8] HAMMER PURGSTALL [9] GOETHE [10] THOLOCK

ان کے ہاں نوافلاطونی افکار کے پرتو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی سال ۱۸۲۱ء میں ایک جرمن مستشرق فریدرِچ روکرٹ[11] نے ۴۴ غزلیات پر مشتمل ایک مجموعہ شائع کیا۔ یورپ میں غزل سرائی کی تاریخ میں یہ پہلا ادبی نمونہ تھا۔ روکرٹ نے فی الواقع بہت موثر اور دلآویز شعر کہے ہیں۔ یہ مختصر مجموعہ بعد کے شعراء کے کلام پر اثر انداز رہا اور ایک مخصوص ادبی طرز بن گیا۔ روکرٹ کی غزلیں مولانائے روم کی غزلوں کا ترجمہ نہیں ہیں لیکن اتنا واضح ہے کہ ہیمر پرگسٹال کی تاریخ ادبیات ایران اور مولانائے روم کے کلام کے تراجم کا اس نے اثر قبول کیا ہے۔ روکرٹ نے ان مطالب کو نئے انداز میں ڈھالا۔ مگر یہ غزلیں مولانائے روم کی غزلیات اور ان کی شخصیت کا تعارف کراتی ہیں۔ روکرٹ بھی گویا مولانائے روم کی مانند شمس تبریزی کی شخصیت میں کھو گیا اور یہ غزلیات اس کیفیت کی آئینہ دار ہیں۔ جرمنی زبان میں اس کے بعد فلسفہ اور الہیات کی جن کتابوں میں بھی اسلامی تصوف یا رومی سے بحث کی گئی، روکرٹ کی ان غزلیات سے ہی استشہاد کیا گیا اور شاید اب تک رومی کے عشق اور حسرت ناتمام کی جرمنی زبان میں کسی نے بھی اس سے بہتر ترجمانی نہیں کی ہے۔ جیسا کہ اشارہ کیا گیا، یہ حقیقی ترجمہ نہیں ہے۔ پھر بھی اتنا متداول ہے کہ ۱۹۰۳ء میں اسی کی بنا پر مولانا کے اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی عمل میں آیا ہے۔ روکرٹ کے بعد دوسرے مستشرقین نے بھی کوشش کی کہ مولانا کی تصانیف کا جرمنی میں ترجمہ کر دیں۔ ۱۸۳۸ء میں روزن وگ شوانو[12] نے دیوان شمس تبریزی (دیوان غزلیات مولانا رومی) کا ایک انتخاب جرمنی زبان میں ترجمہ کیا اور اگرچہ یہ ترجمہ روکرٹ کے ترجمے کے مقابلے میں اصل متن سے قریب تر تھا، مگر اسے وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ ۱۸۴۹ء میں روکرٹ نے مثنوی کے دو دفتر جرمن زبان میں منظوم ترجمے کئے۔ اور ۱۸۸۰ء میں وہن فیلڈ[13] اور ریڈ ہاؤس[14] بھی مثنوی کا ترجمہ کرنے میں لگ گئے۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں مولانائے روم اپنی تصانیف کے انگریزی اور جرمنی تراجم کی بنا پر سارے یورپ میں ایک بڑے صوفی اور وحدت الوجود کے نمائندے کے طور پر مشہور ہوئے۔ آتھے[15] کی نظر میں وہ سارے جہان میں وحدت الوجود[16] کے سب سے بڑے داعی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا تاریخ

---

[11] FRIEDRICH RUCHERT [12] ROZENZWEIG SCHWANNAU

[13] WHINFIELD [14] REDHOUSE

[15] مراد DR. HERMAN ETHE سے ہے (مترجم)۔ [16] PANTHEISM

ادبیات عالم میں اپنی قوت فکر اور لطیف نکتہ آفرینی کی بنا پر دائمی شہرت کے سزاوار ہیں۔ اگر کہا جائے کہ آر۔ اے نکلسن[16] نے مولانائے روم کے سلسلے میں یورپ میں سب سے اہم خدمات انجام دی ہیں، تو یہ کوئی مبالغہ آمیز ادعا نہیں ہوگا: نکلسن نے اپنی ابتدائی و انتہائی علمی و ادبی تحقیقات کو عموماً تصوف اور خصوصاً مولانائے روم پر مرتکز رکھا۔ ۱۸۹۸ء میں انھوں نے 'دیوان[17] شمس تبریزی' کی منتخب غزلیات کو شائع کروایا۔ ممکن ہے کہ ان کے ایک دو نظریات سے آج اتفاق نہ کیا جائے۔ مثلاً نو افلاطونیوں کے افکار جو اس وقت غیر معمولی مروج تھے، مگر عام طور پر نکلسن کا ترجمہ اور حواشی افادات سے خالی نہیں ہیں۔ اس مستشرق کا اس سلسلے میں سب سے بڑا شاہکار مثنوی معنوی کا کئی قدیم مخطوطوں سے مقابلہ کر کے چھپوانا اور اسے انگریزی میں ترجمہ اور شرح کرنا ہے۔ وہ مدتوں مثنوی کے مطالعہ اور درک مطالعہ سے محظوظ رہا۔ اور مغرب و مشرق کے فضلاء کی خاطر اس کے تحقیقی کام کی اہمیت واضح ہے۔ جتنا ممکن تھا اس نے لغوی اور معنوی اشکالات کو بھی حل کیا ہے۔ تصحیح و ترجمہ کے علاوہ نکلسن نے مولانا کی تصانیف کے "انتخابات" بھی مرتب کئے۔ مثنوی کی حکایات، ابیات اور غزلیات کو انگریزی نظم اور نثر میں ترجمہ کیا۔ اور ان کوششوں سے مولانا کے عشق کے اس مشعل بردار مستشرق نے رومی کو انگلستان اور امریکہ میں خوب روشناس کرایا ہے۔

نکلسن کے بعد اس کے جانشین اور کیمبرج یونیورسٹی کے استاد لے۔ جے آربری[18] نے حیرت انگیز تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا، اور مولانا کی گفتار کے بہت سے تراجم شائع کروائے ہیں مثلاً 'فیہ مافیہ' رباعیات اور منتخب حکایات۔ آربری نے راقم الحروف کو بتایا کہ وہ باقی عمر بھی ایسی تحقیقات کرتے رہیں گے اس لئے کہ رومی کے اشعار سے روح کو غیر معمولی معنوی تسکین ملتی ہے۔

جرمنی میں ایچ ریہر[19] کے عالمانہ مقالات کا ذکر ضروری ہے۔ انھوں نے استنبول اور قونیہ کے کتب خانوں سے رومی کی کتب کے مخطوطات پر اور مولانا کی اولاد کے بارے میں تحقیقات کی ہیں اور رومی کے سماع کے بارے میں ایک مفید اور جامع مقالہ لکھا ہے۔

علماء اور مستشرقین کے علاوہ بہت سے یورپی شعراء نے بھی رومی کی رموز اور اصطلاحات سے

---

[16] R. A. NICHLSON

[17] SELECTED POEMS OF THE DIWAN-I-SHAMS-I-TABRIZ

[18] A. J. ARBERRY [19] H. RIHGR

دلچسپی ظاہر کی ہے۔ مولانا کی بعض تشبیہات مثلاً ان کی "حسرت زدہ نے" جو رمز سماع کے طور پر استعمال ہوتی ہے، جرمنی، انگریزی اور فرانسیسی ادبیات میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ لیکن جن شعراء نے رومی کی تقلید کی ہے، تعداد میں زیادہ نہیں ہیں۔ کم از کم گوئٹے کے تحت تاثیر حافظ کی تقلید کرنے والے شعراء کے مقابلے میں مولوی کی روش پر چلنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔

یہاں ایک سن رسیدہ شاعر کا ذکر کر دیا جائے جو برلن میں مقیم ہے۔ یہ شاعر مولانا کا عاشق ہے۔ اس کے عشق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ چند سال قبل بہانے کر کے وہ روسی علاقے سے بھاگ نکلا اور سیدھا قونیہ جا پہنچا۔ اس شاعر نے ۳۰ سال قبل مولانا کی تعلیمات سے متاثر ہو کر سو آبدار غزلیں کہی تھیں۔ اس شاعر کا نام ہینز منکے[20] ہے اور فارسی زبان سے نابلد ہے۔ یہاں میں اپنی کتاب کا ذکر بھی کر دوں۔ میں نے بھی مولانا رومی کی تقلید و پیروی میں غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے۔ مستشرقین کی مساعی اور مولانا کے اشعار کے اتنے تتبع کے باوجود یورپ میں ان کا نام عمر خیام، شیخ سعدی شیرازی یا خواجہ حافظ کے برابر مشہور نہیں ہو سکا۔ اس لئے ان کے حقیقت آمیز بلند افکار کی تاثیر کی خاطر ہمیں سرزمین مشرق کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

ایران میں مثنوی معنوی کی صدہا شرحیں لکھی گئی ہیں جن کی توضیح کی چنداں ضرورت نہیں ہے[21]۔ قرون گزشتہ سے لیکر اب تک ایرانی فضلاء مولانا کے آثار و افکار کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے اور موجودہ زمانے میں اس کا کامل نمونہ پروفیسر بدیع الزمان فروزانفر کی تحقیقات و تدقیقات میں دیکھا جا سکتا ہے اور تمام مستشرق اور مولانا کے دوسرے دلدادگان اس معاصر محقق اور فاضل استاد کی خدمات کے سپاس گزار ہیں[22]۔

عرب ممالک میں مولانائے رومی کے افکار کی تاثیر معمولی اور جزوی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل شیخ

---

[20] HANNS MEINKE [21] چونکہ مقالہ نگار کے مخاطب ایرانی تھے۔ (مترجم)

[22] پروفیسر فروزانفر نے دیوان شمس تبریزی کو ایڈٹ کرنے کے علاوہ فیہ ما فیہ، نیز مولانا کے والد بہاؤالدین (م ۶۲۸ھ) اور ان کے صاحبزادے سلطان ولد کی تصانیف کو شائع کروایا ہے۔ زندگانی مولانائے رومی مولوی، مآخذ مثنوی، حکایات مثنوی اور شرح مثنوی شریف، جس کی ۳ جلدیں چھپ چکی ہیں، ان کی معروف تالیفات ہیں۔ علی دشتی صاحب نے ان ہی کے ایما پر "سیرے در شمس تبریزی" لکھی اور شائع کی ہے۔

یوسف بن احمد الموسوی نے "المنہج القوی لطلاب المثنوی یا فی شرح المثنوی" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جو قاہرہ میں چھپ چکی ہے مگر قرونِ وسطیٰ میں مولانا کے افکار و نظریات ممالک عرب میں مجموعی طور پر نامعلوم ہی رہے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہراً یہ ہے کہ فارسی شعر اور عربی تصوف میں توافق نہیں ہے۔ اور اسی لئے زبان پہلوی کا یہ قرآن متضاد نظریات کے حامل افراد کے ہاں رواج نہیں پا سکا ہے۔

۱۳۳۶ ہجری شمسی میں عبدالعزیز جواہر کلام نے مثنوی کا عربی میں منظوم ترجمہ تہران سے شائع کیا ہے۔ مرحوم عبدالوہاب عزام نے جو پاکستان میں (متحدہ عرب جمہوریہ کے) سفیر تھے۔ اور ڈاکٹر محمد اقبال کی بعض تصانیف کو عربی میں منتقل کر چکے ہیں، انھوں نے مولانائے روم کے بعض اشعار کو بھی عربی میں منتقل کیا ہے مگر اعتراف کرنا چاہیئے کہ رومی کا دوسرا روحانی وطن برصغیر ہند و پاکستان ہی ہے۔

مولوی معنوی کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد ان کی پوری مثنوی کو مشرقی بنگال والے پڑھنے لگے تھے یہاں تک کہ وہاں کے ہندو اور برہمن بھی اس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اور بنگال کے ہنود کے اشعار میں بھی مولانا کی "حسرت زائے" کی صدائے بازگشت ملتی ہے۔ بنگالی مثنوی کو اپنے ملّی نغمات سے ہم آہنگ کر رہے تھے۔ اور بعد کے زمانے میں یہاں کے فضلاء نے مثنوی کے منظوم و منثور کئی ترجمے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان میں سے بعض تراجم ابھی تک چھپے نہیں اور مشرقی پاکستان کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مولانائے رومی کے حالات زندگی مشرقی پاکستان کے پرائمری اسکولوں کے نصاب میں بھی شامل ہیں اور بچّے بچّے کے ورد زبان ہیں۔

برصغیر ہند و پاکستان کے صوفیانہ ادب میں مثنوی معنوی کے اثرات کو معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگر برصغیر کے کتب خانوں کے مخطوطوں کی انگریزی، جرمنی یا فرانسیسی فہرست پر ایک نظر ڈالیں تو مثنوی کے ایسے ہزاروں نسخے نظر آتے ہیں جو اس دیار میں لکھے گئے ہیں۔ اس طرح مثنوی کی فارسی، اردو، بنگالی، پنجابی اور دوسری زبانوں میں متعدد شرحیں موجود ہیں۔ تاریخ میں برصغیر کے صوفیاء کی متعدد حکایات ان صوفیاء سے مولانا کے معنوی روابط کی حامل ہیں۔ مثلاً شیخ ابو علی قلندر جو شیخ قطب الدین دہلوی کے مرید تھے، قونیہ تشریف لے گئے اور مولانا سے استفادہ کیا ہے۔ برصغیر کے صوفیاء کا ایک معتبر سلسلہ چشتیہ ہے جس میں مثنوی کا درس و مطالعہ لوازمات میں شامل ہے۔

"خیر المجالس" حضرت چراغ دہلوی کے ملفوظات و فرمودات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار مولانائے روم کا ذکر ملتا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں سیّد جہانگیر اشرف سمنانی قونیہ گئے اور سلطان ولد سے ان

کے والد مولانائے روم کے حالات معلوم کئے اور یہ بات "لطائف اشرفی" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے ہم عصر مظہر گزنہ (۴ھ - ۷۹۰ھ) نے مولانا کی منقبت میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔

مولانائے روم اور شمس تبریز برّصغیر کے عوامی ادب[23] میں بھی عشق الہٰی کے رموز سمجھے جاتے ہیں اور شمس تبریز کے نام کو سندھ اور پنجاب کے صوبوں کی ادبیات خصوصاً لوک ادب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مولانائے روم کی محبت برصغیر کے عوام اور خواص کا خاصہ رہا ہے۔ اکبر شہنشاہِ اعظم کو مثنوی بہت پسند تھی اور اکثر اسے سُنا کرتا تھا۔ اس کے پوتے شہنشاہ شاہجہان نے ایک مجرم شاعر کو صرف اس لئے معاف کر دیا تھا کہ اس نے اپنی تقصیر کی معافی کی خاطر مولانا کی ایک رباعی کو مترنم آواز میں پڑھا تھا۔

داراشکوہ خود مسلک عرفان کا سالک تھا۔ اس نے سلطان ولد کی مثنوی ولدنامہ کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہے، اور وہ مخطوط ابھی موجود ہے۔ داراشکوہ مثنوی کا عاشق تھا۔ اور اس کا بظاہر خشک اور زاہد بھائی شہنشاہ اورنگ زیب بھی جیسا کہ کئی مؤرخین نے لکھا ہے۔ خوش الحان مثنوی خوانوں کی محفل میں جاتا اور مولانا کے اشعار سن کر زاروقطار روتا تھا۔ مورخین نے ایسے لوگوں کے نام بھی تحریر کئے ہیں، جو خاص اہتمام اور لحن سے مثنوی پڑھا کرتے تھے۔

اس وقت کے سندھ کے دارالحکومت ٹھٹھہ کے باشندوں پر مولانا کے خاص اثرات نظر آتے ہیں۔ ایک صوفی شاعر جہانگیر ہاشمی ہے جس کی پدری اور مادری نسبت بالترتیب میر قاسم اور سید نعمت اللہ ولی کرمانی سے ملتی ہے وہ سندھ میں سلطان حسن ارغون کے دربار سے وابستہ رہے اور وہیں ۱۵۳۰ء میں فوت ہوئے ان کی مختصر سی مثنوی "مظہر الآثار" کے ایک باب کا عنوان ہے: "اس صوفی ذاکر کی کہانی جس نے اپنے شیطان کو آدمی کی صورت میں دیکھ لیا اور کہا: مدتوں سے اللہ اکبر کہہ رہے ہو ایک بار بھی لبیک نہیں سنتے۔" اس کے بعد مولانا روم کی مشہور منظوم حکایت نقل کی گئی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی آرزو کے مطابق دعا نہیں کرتا۔ اس کی دعا خدائے تعالیٰ کے خطاب کا جواب ہوتی ہے۔ اس بات نے یورپ کے علماء پر بھی اثر ڈالا ہے۔ سب چاہتے ہیں کہ وہ ایسی مفید دعا کریں جس کی جناب خداوندی سے صد بار لبیک فرمائی گئی ہو۔

بہرحال تاریخ ادبیات سندھ میں ایسے کئی معتقدانِ مثنوی کا ذکر ملتا ہے جو مولانا سے غیر معمولی شغف

رکھتے اور مثنوی شریف کو مؤثر اور حزیں لے میں پڑھتے اور سامعین پر رقت طاری کر دیتے تھے۔

مولانا کا سلسلہ مولویہ تو برصغیر میں مروّج نہ ہو سکا لیکن مولانا اور مثنوی کا عشق سب طریقوں چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ کا خاصہ رہا ہے۔ نقشبندی سلسلے کے ایک بزرگ محمد زمان اوّل ہیں، انھوں نے اپنا پورا کتاب خانہ دوسروں کے حوالے کر دیا، اور اپنے لئے قرآن مجید کے علاوہ مثنوی اور دیوان حافظ کا ایک ایک نسخہ پاس رکھا۔ مولانا کے اثرات ایک اور بڑے صوفی پر دیکھے جا سکتے ہیں وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی ہیں، جن کا انتقال ۱۷۵۶ء میں ہوا ہے۔ یہ عظیم صوفی اور سندھی زبان کے پہلے صاحب دیوان نامور شاعر مولانا کے محبّوں میں شامل تھے۔ جن مؤلفین اور محققین نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے احوال و افکار پر کتابیں یا مقالات لکھے مثلاً ٹی۔ ایچ۔ سورلے[۲۴]، سب نے اپنے اوپر مثنوی کے اثرات کا ذکر بھی کیا ہے۔ ایک مصنف لکھتا ہے: "سندھ کے سلطان نے مثنوی مولانائے روم کا ایک نفیس اور مزین نسخہ شاہ بھٹائی کی خدمت میں بھیجا، اور اس طرح ان سے دُوری کی وجہ سے فیضان میں جو کمی محسوس ہو رہی تھی، اس کی تلافی کر لی"۔ ان مؤلفین نے البتہ مثنوی کے اثرات کا گہرا مطالعہ نہیں کیا اور ظاہری افادات کا ذکر کیا ہے۔ شاہ عبداللطیف کے دیوان" شاہ جو رسالو" میں مثنوی کے زیر اثر کئی تشبیہات اور تمثیلات موجود ہیں مثلاً رموز نے، ہاتھی اور اندھوں کی حکایت جس میں وہ فرماتے ہیں:

آب کم جو، تشنگی آور بدست   تا بجوشد آبت از بالا و پست

اگر پانی کی تلاش میں ہیں تو پانی ان کی تلا شـ میں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ صرف انسان ہی خدا کی جستجو نہیں کرتا خود خدا بھی انسان کی تلاش میں ہے تاکہ اسے ہدایت کا آب حیات پلائے، اور راہ راست پر آجانے سے اس کی روحانی تشنگی دُور ہو سکے۔ شاہ عبداللطیف نے اپنے رسالے کے ایک باب میں مولانائے روم کے بعض رموز کی طرف اشارے کئے ہیں۔ فرماتے ہیں: "طالب بہت ہیں اور جمال کا چشمہ وہی ہے"۔ یہ رومی کی بات ہے" پہلے خود کو غائب کرنا اور پھر معشوق کی طرف آنا"۔ یہ بھی رومی کی گفتار ہی کا پرتو ہے۔ چونکہ شاہ بھٹائی کے اشعار اور فرمودات وادی سندھ کے خواص و عوام کی زبان پر جاری و ساری ہیں۔ اس لئے ان کے ذریعے سے مولانائے روم کا فیضان بھی وہاں پہنچ گیا ہے۔ یہاں پر ایک دوسرے شاعر کا ذکر کر دیا جائے

---

۲۴ T. H. SORELEY

وہ بیدل روھڑی وارہے۔ جس نے اپنی کتاب 'دلکشا' کے ہر باب میں قرآن مجید کی ایک آیت، ایک حدیث رسولؐ، مثنوی کے ایک شعر اور شاہ عبداللطیف کے ایک قول سے اپنے بیان کو مستند کیا ہے اور اس طرح اپنی صوفیانہ نظم کے زوردار مطالب کو بیان کیا ہے۔

مثنوی شریف کی برصغیر میں فارسی یا اردو میں جو شروح لکھی گئیں، وہ متعدد ہیں مگر ان میں دو بہت معروف ہیں۔ بوستان تالیف عبدالمجید سپل پیتی اور شرح بحرالعلوم جو ۱۸۱۹ء میں لکھی گئی ہے۔

جس طرح ترکی زبان میں مثنوی کا ایک منظوم ترجمہ اسی بحر میں موجود ہے ایسے ہی منظوم ترجمے برصغیر ہندو پاک کی زبانوں میں بھی ملتے ہیں۔ سندھی زبان میں "اشرف العلوم" کے نام سے ایک منظوم ترجمہ دین محمد ادیب نے کیا جو بیس سال قبل چھپا تھا۔ ایک اور سندھی منظوم ترجمہ سے ہمیں آگاہی ہے مگر وہ ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔

پنجابی میں دو ترجمے اور شرحیں میں نے دیکھی ہیں۔ پشتو میں ایک ناتمام منظوم ترجمہ پشاور یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ایک جدید اردو ترجمہ بھی مسودے کی صورت میں دیکھا ہے۔ البتہ مرحوم سیماب اکبر آبادی کا منظوم اردو ترجمہ کئی بار چھپا اور میری نظر سے گزرا ہے۔

گزشتہ ادوار میں جتنی شرحیں اور ترجمے کئے گئے۔ ان میں وحدت الوجود کا رنگ غالب ہے۔ اس سے ہمیں انکار نہیں کہ مثنوی میں ایسے افکار موجود ہیں جن میں ابن عربی کے افکار سے ہم آہنگی نظر آتی ہے لیکن مجموعی طور پر مثنوی ایک مختلف جہان معانی ہے۔ اس میں آیات قرآن مجید، احادیث رسولؐ، قدیم صوفیاء مثلاً امام محمد غزالی، حکیم سنائی اور عطار کے اقوال سے استشہاد کیا گیا مگر جدت آفرینی کے ساتھ۔ سچ تو یہ ہے کہ مثنوی کے بحر بیکراں سے ہر کوئی اپنی فکر اور حوصلے کے مطابق مطالب گیری کرتا، اشعار کا انتخاب کرتا اور ایک فکری و عملی نظام کی بنیاد رکھتا ہے۔ وحدت الوجود کا نظریہ تیرھویں صدی عیسوی میں چونکہ تصوف اسلامی کے اہم تر مطالب میں شامل تھا، اسی خاطر مثنوی کے مغربی و مشرقی شارحین نے اس کتاب کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ اور اسی خاطر مرحوم علامہ محمد اقبال، پاکستان کے قومی شاعر بھی شروع شروع میں مولاناؒ روم کے افکار میں وحدت الوجود کی تعلیم تلاش کرتے رہے ہیں۔ اقبال نے اپنا تحقیقی مقالہ "ایران میں فلسفہ ماوراء الطبیعۃ کا ارتقا" ۱۹۰۷ء میں ڈاکٹریٹ کے حصول کی خاطر میونخ یونیورسٹی میں پیش کیا اس میں وہ مولانا کے بارے میں لکھتے ہیں: اس مکتب فراق کے امام اعظم رومی اعظم ہیں۔ آپ نے عالم کے قدیم

نوافلاطونی تصور کو لے لیا جو ہستی کے مختلف دائروں میں کارفرما ہے۔ ان کی نظر میں ثنویت ایک ظاہری تجلّی، ایک خواب یا ایک سایہ ہے۔" الخ[25] اقبال اس مطلب کے اثبات کی خاطر روح ناطقہ کا وہ تصور پیش کرتے ہیں جو ساری دنیا میں نمایاں ہے۔ یہ بات نوافلاطونی نظریات اور مولانائے روم کے اشعار میں موجود ہے کہ

از جمادی مردم و نامی شدم   واز نما مردم زحیوان سرزدم

مگر اپنی عمر کے آخری ایام میں اقبال نے ان ہی اشعار سے انسانی ارتقاء کے نظریے کی توثیق کی ہے ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی کے بعد انہیں احساس ہوا کہ نوافلاطونی وحدت الوجودی نظریہ مولانائے روم کا ایک ہلکا رنگ اور ان کی فکر کے عظیم قالین کا گویا ایک پارینہ گوشہ ہے۔ میرا خیال ہے اقبال کے نظریہ میں اس تبدیلی کے آجانے میں علامہ شبلی نعمانی کی تالیف "سوانح مولانائے روم" کا بھی اثر ہوگا جو ۱۹۰۹ء میں چھپی ہے[26] شبلی کتاب کے آخری حصے میں یورپی نظریہ ارتقاء پر بڑی مفکرانہ بحث کرتے اور تجدّد امثال کے تصور کی مدد سے روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ مولانا کے اشعار سے ایک ایسا روحانی ارتقا پیش کرتے ہیں جس کی رو سے انسان نہ صرف کمال کے نزدیک بلکہ ربوبیت کے ظل سے بہرہ مند ہونے لگتا ہے:

از جمادی مردم و نامی شدم   وز نما مردم، زحیوان سرزدم

مردم از حیوانی و آدم شدم   پس چہ ترسم، کی زمردن کم شدم

حملہ دیگر بمیرم از بشر   تا برآدم از ملائک بال و پر

۱۹۱۱ء سے مولانائے روم علامہ اقبال کے نزدیک وحدت الوجود کا مظہر نہ رہے بلکہ تصوف اسلامی کا ایک پاکیزہ نمونہ بن گئے۔ وہ اقبال کے لئے مرشد راہ اور عشق جاودانی کا محرک بنے۔ اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں چھپی اور اس میں یہی نظریہ کارفرما ہے:

رومی خود بجود پیر حق سرشت   کو بہ حرف پہلوی قرآن نوشت

گفت ای دیوانۂ ارباب عشق   جرعہ ای گیر از شراب ناب عشق

اسرار خودی کی رو سے جیسا کہ اشعار منقولہ میں مذکور ہے۔ اقبال نے مولانائے روم کو خواب میں دیکھا اور

---

[25] محترمہ مقالہ نگار نے اقتباس کو پس و پیش کر دیا ہے۔ (مترجم)

[26] اقبال کے سلسلے میں یہ بات غالباً کسی اور نے نہیں لکھی ہے (مترجم)

ان کو پیرو مرشد مان لیا مولانا سے اظہار عشق و محبت اقبال کی ساری تصانیف میں جلوہ گر ہے۔ وہ اپنے مکاتیب میں دوستوں کو مثنوی کا مطالعہ کرنے کی بار بار سفارش کرتے ہیں۔ اقبال کی نظر میں مثنوی کا دقیق و عمیق مطالعہ فکر انسان کی معنوی تشکیل و تعمیر میں ممد و معاون ہے۔

مولانائے روم اقبال کا "خضر راہ" ہے۔ ہمارا یہ عظیم معاصر شاعر اپنی ساری مشکلات کے حل کی خاطر مولانائے روم سے رجوع کرتا ہے۔ وہ رومی سے سوال کرتا ہے اور اس کے اشعار کی روشنی میں جواب تلاش کرتا ہے۔ اقبال نے اپنی مثنویوں میں جا بجا رومی کے برگزیدہ اشعار پر تضمین کی ہے۔ اقبال نے اپنی بیشتر مثنویاں مثنوی شریف کی بحر اصل مسدس مقصور یا محذوف ہی میں لکھی ہیں۔ اس طرح مولانا کے اشعار کی تضمین ان کے لئے آسان ہے۔ وہ ہمیشہ مولانا کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے ہیں۔

پیر رومی مرشد روشن ضمیر　　　کاروان عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب　　　خیمہ را از کہکشاں سازد طناب

رومی اقبال کے لئے چراغِ راہ اور اسرار حیات کا شارح اور ترجمان ہے اس لئے کہ "نور قرآن درمیانِ سینۂ اش" روشن ہے مولانا کی بہترین توصیف اقبال نے "جاوید نامہ" میں کی ہے وہاں شاعر مولانا کی ایک غزل کو مترنم آواز میں پڑھ رہا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر　　　کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست

غزل خوانی کے بعد مولانائے روم کی "روح" ظاہر ہوتی ہے اور اقبال کو اسرار حیات، رموز زمان و مکان نیز معراج سے آگاہ کرتی اور سیر افلاک کی خاطر اوپر لے آتی ہے اقبال فرماتے ہیں :-

" فکر من بر آستانش در سجود "

اور یہ شعر بھی کتنا بر محل ہے :

نے آن نے نوازے پاک بازے　　　مرا با عشق و مستی آشنا کرد

اقبال نے نَے کی رمز کو بہت استعمال کیا ہے اور اس کے مختلف معانی بیان کئے ہیں : نَے اپنی حسرت کے اظہار کی خاطر نغمہ سرائی کرتی ہے۔ حسرت و اشتیاق سے ہی اس کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ انسان بھی حسرت کے عالم میں فعال تر ہو جاتا ہے :

جمال عشق گیرد از نَے او　　　نصیبے از جلال کبریائی

مولانائے روم نے اپنی تصانیف میں جلال وجمال دونوں کا درس دیا ہے۔ ان کے ہاں عشق وکبریائی دونوں ہیں۔ اسی خاطر وہ لوگوں کے حقیقی راہبر ہیں۔ غیر کبریا سے عشق، غیر جلالی سے جمالی یا غیر جمالی سے جلال کا اظہار انسان کے روحانی اقتدار کی خاطر خطرناک ہے۔

اقبال کی شاعری میں اور واقعتاً بھی مولانائے روم عقل کی افسردہ قوت کا مخالف ہے۔ وہ عشق سوزاں ہے۔ اقبال مولانا کو کہیں ابن سینا اور کہیں امام رازی سے مقابلہ کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔

"بوعلی" اندر غبار ناقہ گم　　　دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

ایں فروتر رفت تا گوہر رسید　　　آں بہ گردابی چو خس منزل گرفت

اور: زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی [۲۷]

اقبال نے اپنے اشعار میں مغربی استاد گوئٹے اور مشرقی راہنما رومی کو برابر حیثیت میں دکھایا ہے۔[۲۸]

"نیست پیغمبر ولے دارد کتاب"

"فاؤسٹ" میں بھی مثنوی کی مانند انسانی ارتقاء اور عشق وحسرت کے لازوال اسرار درج ہیں۔

اقبال کا خیال تھا کہ عجم کے لالہ زاروں سے کوئی اور رومی پیدا نہ ہوگا۔ اس لئے وہ اپنے کو اس بزرگ کا خلیفہ کہتے ہیں۔

نکتہ ہا از پیر روم آموختم　　　خویش را در حرف او وا سوختم

اور: شرار جستہ ای گیر از درونم　　　کہ من مانند رومی گرم خونم

اسی مناسبت سے اہل پاکستان اقبال کو "رومی عصر" کہتے اور اس ضمن میں کتابیں اور مقالے لکھے جاتے رہے ہیں۔[۲۹] اور اقبال پر رومی کے اثرات کی کیفیت لکھی جاتی رہی ہے۔ ہم جتنی بھی کوشش کریں، ان دو

---

[۲۷] ارمغان حجاز میں فرمایا ہے:

ز رازی حکمت قرآں بیاموز　　　چراغی از چراغ او بیاموز

ولی ایں نکتہ را از من فراگیر　　　کہ نتواں زیستن بی مستی و سوز　(مترجم)

؎ پیام مشرق ص ۲۴۶ - مطبوعہ ۱۹۴۶ء: جلال و گوئٹے

[۲۸] مقالہ نگار کی یہ رائے مبالغہ آمیز ہے (مترجم)۔ [۲۹] مقالے تو بہت لکھے گئے مگر کتاب "رومی عصر" (فارسی) کے مؤلف ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی صاحب ہیں۔ مطبوعہ تہران ۱۳۳۲ ہجری شمسی (مترجم)

بزرگوں کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ دونوں میں بڑی مشابہت ہے مگر اختلاف سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال کے ایک عدسے کی مانند مولانائے رومی کے دائمی عشق، حسرت، سوز و ساز اور تکامل انسان کی شعاعوں کو جذب کیا اور ان کی معنوی آتش سے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں کو گرمایا ہے۔ اس طرح مولانا نے اپنے پاکستانی مرید کے ذریعہ ایک (اسلامی) مملکت کے قیام میں مدد کی ہے اور یقیناً گزشتہ سات سو سالوں میں مولانا کے کلام کی اتنی تاثیر اور کسی نے قبول نہیں کی ہے۔

ہاں جب بھی لوگ عشق الٰہی کی طرف متوجہ ہوں، جب بھی بنی آدم ظواہر سے ہٹ کر حقائق کی طرف جانا چاہیں، جب بھی عشق جیسی سرمدی آگ میں جلنا چاہیں جو ان پر گلستان ثابت ہو، اس وقت مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی کے اشعار کی طرف ان کو رجوع کرنا ہوگا کیونکہ بقول رومیؒ۔

کعبۃ العشاق باشد ایں مقام
ہر کہ ناقص آمد ایں جا شُد تمام

---

۳۰ مقصد یہ کہ مولانا کے کسی اور معنوی مرید کے انفاس سے نئی مملکت وجود میں نہ آسکی۔ فاضل مقالہ نگار کی یہ رائے لائق ستائش ہے۔ مگر افسوس کہ انھوں نے علامہ اقبال کی ان نتیجہ خیز مساعی کا ذکر نہ کیا جن کے ذریعے انھوں نے پیغام مولانائے رومی کو ساری دنیا میں اور خصوصاً عالم اسلامی میں عام کیا ہے:

عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا　　عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

(اضافہ مترجم)